OPEN ACCESS
Al-Aẓvā الاضواء
ISSN 1995-7904 ;E 2415-0444
Volume 41, Issue, 65, 2026
www.aladwajournal.com

سفر طائف میں دعوت کا منہج اور عہد حاضر کی دعوتی مشکلات واسلوب کا تحقیقی جائزہ

A Research Review of the Method of Invitation During the Journey to Taif and the Difficulties and Methods of Invitation in the Present Era

Sayed Hasnain Shah
Ph.D Scholar, Department of Islamic Studies
University of Karachi, Karachi

Umair Mahmood Seddiqi
Assistant Professor, Department of Islamic Studies
University of Karachi, Karachi

Abstract

KEYWORDS

Prophetic Da'wah, Journey to Taif, Contemporary Da'wah Challenges, Qur'anic Methodology, Tazkiyah, Hikmah, Islamic Preaching, Seerah Studies

Date of Publication: 20-05-2026

This research article explores the prophetic methodology of da'wah (invitation to Islam) as exemplified in the event of the Taif journey, analyzing its relevance and practical application in contemporary times. The journey to Taif represents a critical phase in the Makkan period of the Prophet Muhammad's (ﷺ) mission, reflecting the principles of perseverance, wisdom, and patience in the face of rejection and hostility. The study highlights how the Prophet's approach combined spiritual nurturing (tazkiyah), education, and organized efforts (tanzeem), all rooted in the Qur'anic framework. It further aims to draw lessons from the Prophetic strategy to respond to the current challenges facing Islamic da'wah globally. By assessing the methods employed by the Prophet ﷺ and comparing them to modern da'wah needs, the article offers a reflective and practical perspective for Islamic scholars and preachers.

سیرت طیبہ میں ہمیں وہ تمام مراحل نظر آتے ہیں جو کسی بھی انقلابی جدوجہد میں پیش آنے لازمی ہیں۔ پورا عالم امتِ دعوت واجابت ہے، ان کی طرف اللہ کے محبوب ﷺ کو مبعوث کیا گیا اور انہیں سب لوگوں کو تبلیغ کرنے کا حکم دیا گیا۔ پھر جس نے قبول کیا اور اللہ کے دین میں داخل ہوا وہ امت اجابۃ سے ہو کر اُس امت میں آ گیا جنہوں نے حق کو پہچان لیا، ایمان لائے اور صراط مستقیم پر قائم رہے۔ اس انقلابی جدوجہد کا دورِ مکی میں جو پہلا مرحلہ نظر آتا ہے وہ تصنیف انسانی ہے۔ یہ مرحلہ دعوت و تبلیغ، تربیت، تزکیہ اور تنظیم سازی پر مشتمل ہے۔ جہاں تک دعوت و تبلیغ کی بات ہے اس میں سب سے پہلے یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس دعوت کا منبع، اس کی اساس وبنیاد اور مدار قرآن مجید ہے۔ دعوت، تبشیر، اسلوب، تزکیہ، حکمت ہو یا علم ان سب کی بنیاد قرآن کریم ہے جہاں اس قرآن کے اصل عالِم ﷺ پوری امت کی تربیت فرماتے ہیں اور انہیں کتاب وحکمت سکھاتے ہیں۔ اس طرح ان مناہج کا اظہار ہوا جن سے مصطفی کریم ﷺ نے پوری امت کو ان کے مختلف مزاج و تنوع کے ساتھ دعوتِ دین ارشاد فرمائی۔

طائف اور دعوت مصطفیٰ ﷺ

آپ علیہ السلام اپنی بعثت کا سب سے پہلے سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے ذکر فرماتے ہیں اور بعد میں دعوت کا اہتمام فرما کر باقی رشتہ داروں کو بھی اسلام کی دعوت دیتے ہیں۔ اسلام کے ان دعوتی مناہج میں جو طائف کا منہجِ دعوت ہے اس میں آپ علیہ السلام اپنے گھر کو چھوڑ کر تنِ تنہا ایک غلام کے ساتھ اسلام کی دعوت دینے نکل پڑتے ہیں۔ اب یہاں طائف کے حال پہ غور کیا جائے تو مکہ کی مماثلت پائی جاتی ہے، یہاں کہ لوگ بھی طبیعت میں مکہ والوں کے مماثل ہیں۔ قرآن کریم میں جو ان لوگوں کا کہنا تھا وہ بیان ہوا کہ: ﴿عَلَى رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ﴾ [(1)] وہ کہتے ہیں یہ قرآن دونوں شہروں (مکہ و طائف) کے کسی بڑے آدمی پہ نازل کیوں نہیں ہوا؟ یعنی ان کی طبع میں تکبر اور (Racism) موجود تھا۔ اس جملے کے کہنے سے وہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہے تھے کہ یہ نبوت کا منصب 'عظیم' ہے۔ تو ان کی نظر میں جو مادی عظمت (نصب، قبیلہ، مال وملکیت، منصب اور شرافت و سرداری) کا متوالی اور حامل ہے وہ اس منصب کے لائق ہے۔ یہاں "رجلین" سے مشرکین کی مراد جاہ مال میں مکہ کا ولید بن المغیرہ اور طائف کا عروہ بن مسعود ثقفی ہیں۔ اور یہ لوگ نہ جانتے تھے کہ نبوت و رسالت کا مرتبہ عظیم اور روحانی ہے جو صرف عظمت نفس وانتخاب خداوندی کا متقاضی ہے، یہ اللہ کی طرف سے ہبہ ہے ایسے شخص کی طرف جو فضائل وکمالاتِ قدسیہ سے آراستہ ہو، جس کی تربیت و تعلیم کا انتظام خود اللہ عزوجل فرماتا ہے۔ یہ ہستی اس عظیم رب کی طالب ہوتی ہے نہ کہ خس وخاشاک، آلودہ دنیا کی۔ آپ علیہ السلام اپنی رسالت حقہ کے اظہار میں معجزات و توحید کی تشریح اور آیات ودلائل سے کام لیا تاکہ ان لوگوں کو ان کی غفلت پہ متنبہ کیا جائے۔ مشرکین کی نہ فقط شرارتوں میں اضافہ ہوا بلکہ ان کے مرض دل یعنی شرک، کفر، عناد، عداوت اور حق سے بغض میں بھی اضافہ ہوا۔ اس لیے انہوں نے

قرآن کریم اور صاحب قرآن صادق الامین ﷺ کو سحر اور ساحر، قرار دیا اور بے باک ہو کر گستاخیاں برتنے لگے، صریح انکار کرتے اور اس عظیم کی عظمت کے بجائے حاملین قرآن و صاحب قرآن کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ اب وہی سورہ زخرف کی آیت جس کا ذکر گزرا اس کے بعد جو آیت کریمہ آتی ہے اس میں اللہ جل شانہ نے دو رحمتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک رحمت تو وہ ہے جو اس رحمٰن کی ہے جو تمام عالم پہ عام ہے۔ جس میں ماننے والا نہ ماننے والا ہر ایک جان برابر ہے، ہر کسی کو کچھ نہ کچھ حصہ اس کی رحمت سے دنیا کے اندر ضرور ملتا ہے۔ جس طرح گزر بسر کے وسائل کسی کو زیادہ تو کسی کو کم، کسی کو وسائل معاش اور سرداری بھی حاصل۔ تو یہ مشرکین ان دونوں شخصیات کو اس لئے بڑا سمجھ رہے تھے کہ ان کے پاس یہ عام رحمت کا حصہ تھا، اس کو ہی سب سے بڑا سمجھ رہے تھے۔ لیکن اس آیت مبارکہ میں جو دوسرا رحمت کا لفظ آیا ہے کہ وہ رحمت جو تمہارے رب کی ہے۔ ﴿وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ﴾[2] تو یہاں اس رحمت سے مراد خاص رحمت ہے اور وہ رحمت محمدیہ ﷺ ہے۔ یہ سب سے اچھی رحمت ہے، ہر اس سے جو آپ جمع کرتے ہیں۔ یعنی جو رب ذوالجلال نے تم پہ اپنی رحمت عام کر رکھی ہے اس سے بھی کئی زیادہ خیر کی رحمت ذات مصطفی کریم ﷺ ہیں۔ اور اے مکہ و طائف کے مشرکین اپنے جن رئیسوں ولید اور عروہ کو تم جاہ و دولت، وجاہت و معیشت کی وجہ سے بڑی چیز سمجھ رہے ہو! وہ اس سراپا رحمت (نبوت و رسالت) کے مقابل تو کیا اس کے در پہ خدمت گزار کے قدموں کی خاک کے بھی برابر نہیں۔ اس در سے جڑے ہر مجاہد کے گھوڑوں کی ناک میں جمی گرد کے برابر بھی نہیں۔ جب یہ اس در پہ خدمت دینے والوں کے چوپائے کے برابر نہیں تو اس خاص رحمت رب کی کیا ہی شان ہو گی۔ لیکن ان لوگوں کے میزان و معیار اس مادی دنیا پہ پڑے تھے۔

اسلوب و منہج

کریم آقا علیہ السلام کا طائف میں جو منہج و اسلوب دعوت ہے اس میں سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ آپ علیہ السلام کا دعوت و تبلیغ کے لئے سب سے پہلے بیرون مکہ سفر فرمانا ہے، اور یہ صرف دعوت دین کے لئے سفر تھا کوئی دوسری رائے نہیں۔ اس میں جو دوسری چیز ہے جب یہ سفر ہوا اس وقت مکہ مکرمہ میں بھی کوئی حمایتی قبیلہ نہیں۔ تیسری چیز ہمیں یہ ملتی ہے آپ علیہ السلام کا یہ سفر مبارک تن تنہا کرنا ہوا۔ روایات کے مطابق ایک غلام ساتھ لیا۔ اب آپ ان تین چیزوں پہ غور کریں کہ طائف میں تبلیغ کا کیا منظر و حال ہے کہ آپ ایک تو اپنے گھر اور خاندان سے دور ہیں۔ اس میں آپ تنہا ہیں اور پیچھے کوئی حمایت بھی نہیں کہ آپ علیہ السلام کو خدانہ خواستہ پیچھے سے کوئی مدد بلانی ہو۔ اور سب سے بڑی بات کہ ان ایک جیسے مشرک مزاج بندوں میں تنہا جا رہے ہیں۔ تو یہ صرف اور صرف تبلیغ دین کی ذمہ داری اور توکل علی اللہ تھی جو شان رسالت کے لائق ہے۔ یہاں مکہ مکرمہ میں آپ نے ابھی تک جو تبلیغی کام سر انجام فرمائے اس میں سب سے بڑی حمایت حضرت ابو طالب کی تھی، کسی کی جرءت نہیں تھی کہ وہ آپ علیہ السلام کو

تکلیف پہنچائے۔ اور پھر کیا خبر کے کسی کے ذہن میں یہ فقرہ گردش کرے کہ سارا کچھ ابو طالب کی سرداری کی وجہ سے ہوا وگرنہ آپ یہ کام انجام نہ دے پاتے اور خاموش رہتے وغیرہ۔ تو آپ علیہ السلام کا طائف کی جانب بغیر کسی حمایت کے جانا یہ ایک ذمہ داری اور شان نبوت کو ظاہر کرتا ہے۔ سید المتوکلین دین کی اشاعت میں بس صرف حکم الٰہی کو دیکھتے ہیں اور پھر اس عمل سے ایک اور بات بھی واضح ہوتی ہے کہ آپ کو اگر کسی مسئلہ کا حل نکالنا ہے آپ اسی انداز کو اختیار کریں جا کر اپنی حق بات کو پیش کریں اور اس کے نتائج کا انتظار کریں یعنی ایک عام یا ریاستی وسیاسی مسئلہ کا حل بھی اسی انداز سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اگر سامنے والا آپ کی پیشکش کو سمجھ لیتا ہے اور قبول کرتا ہے تو آپ سرخرو اور اگر سامنے والا ایسا ہی سلوک اختیار کرے جیسا کہ طائف کے سیاہ بخت رئیسوں نے کیا تو آپ انتظار کریں کہ اللہ پاک ایسے لوگوں کو ذلیل وخوار کرے گا اور آپ کو کامیابی سے سرفراز فرمائے گا۔

طائف میں آپ علیہ السلام کی جس کسی سے بھی جاتے ہوئے ملاقات ہوئی قبیلہ یا بستی میں سے گزرنا یا رہنا ہوا تو آپ نے ان کو بھی تبلیغ فرمائی۔ تبلیغ کے اصول وہی جو قرآن مجید نے بیان کئے ہیں۔ لیکن یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے کہ آپ خود ان کے پاس اپنا گھر بار چھوڑ کر تشریف لے گئیں ہیں اور یہاں پر کسی پہاڑی پہ کھڑے ہو کر سب کو کٹھا کر کے تبلیغ نہیں فرمائی نہ ہی کوئی بڑی دعوت کا اہتمام فرما کر تبلیغ کی بلکہ ہر ایک کو فرداً فرداً ہر ایک گھر میں، قوم میں، جتھے میں، گروہ میں، ہر چھوٹے بڑے کو تبلیغ فرمائی۔

آپ علیہ السلام اپنی اس تبلیغ میں لوگوں کو قرآنی آیات سناتے امر بالمعروف کرتے اور برے کاموں سے روکتے اللہ پاک کی توحید کا اظہار فرماتے اور لوگوں کے مزاج کے مطابق کلام فرماتے۔ آپ نے جو طائف کے لوگوں کو تبلیغ فرمائی ہے مسند احمد میں روایت موجود ہے ابو بکر بن ابو زہیر رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں:

میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو زمانۂ نبوت میں طائف میں یہ فرماتے ہوئے سنا: اے لوگو! قریب ہے کہ تم اہل جنت اور اہل جہنم کو یا اچھے اور برے لوگوں میں امتیاز کر سکو جہاں تک مجھے علم ہے آپ نے فرمایا کہ جنتیوں اور جہنمیوں میں تو ایک پوچھنے والے نے مسلمانوں میں سے سوال کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے جان سکیں گے؟ تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: "بالثناء الحسن، والثناء السّیّءِ" لوگوں کی اچھی اور بری تعریف کے ذریعے، کیونکہ آپ لوگ اللہ کی زمین میں ایک دوسرے پر گواہ ہو۔(3)

معلوم ہوا کہ آپ علیہ السلام نے اس گروہ کو اچھے برے لوگوں کی تعلیم بھی ارشاد فرمائی اور اس میں امتیاز کرنے کا میزان بھی بتایا کہ جو اچھا ہوتا ہے وہ ابدی ہے لوگ اسے اچھائی سے یاد کرتے ہیں اور جو برا ہوتا ہے تو ایسا شخص لائق انعام نہیں۔ اسی حدیث مبارک سے ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ طائف کے اتنے بڑے سفر میں حضرت عداس کے علاوہ بھی کچھ ایک دو لوگ مسلمان ہوئے تھے لیکن سیرت و تاریخ کی کتب میں ان کا ذکر وضاحت کے ساتھ نہیں ملتا۔

آپ علیہ السلام نے جو اس تبلیغ میں ایک اور منہج اختیار فرمایا وہ تھا ان کے مزاج کے مطابق ان کو دلائل دینا تو آپ علیہ السلام نے قرآن مجید سے جو آیات یا سورہ تلاوت فرمائی اس پہ توجہ کریں حضرت خالد عدوانی سے مروی ہے فرماتے ہیں:

انہوں نے آپ علیہ السلام کو بنو ثقیف کے مشرقی اطراف میں دیکھا آپ علیہ السلام کمان پر یا پھر اپنی عصا مبارک پہ ٹیک لگا کہ کھڑے ہیں جب آپ اس خیال سے آئے کہ (ان لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے سے) کچھ مدد حاصل ہوگی (اور دین کی تبلیغ و اشاعت میں آسانیاں پیدا ہوں گی) فرماتے ہیں میں نے آپ ﷺ کو وہاں سورہ ﴿وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ﴾ کی تلاوت کرتے سنا جب تلاوت مکمل فرمالی تو میں نے اس جاہلیت (اسلام لانے سے قبل) کے وقت میں اسے زبانی یاد کرلیا حالانکہ میں اس وقت مشرک تھا پھر میں نے مسلمان ہونے کے بعد اس کی تلاوت کی۔ مجھ سے ثقیف کے لوگوں نے پوچھا کہ تم نے اس شخص سے کیا سنا؟ میں نے انہیں سورہ طارق پڑھ کر سنادی۔ تو ان کے ساتھ جو ایک قریشی تھا اس نے کہا ہم اپنے ساتھی (قبیلہ والے) کو اچھی طرح جانتے ہیں، اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ جو کہتا ہے حق ہے تو ہم اس کی اتباع کرتے۔[4]

یہاں پر غور طلب بات یہ ہے کہ قرآن مجید کے جس حصہ سے آپ علیہ السلام ان کو تبلیغ فرمارہے ہیں اس میں کیا ذکر ہے سورۂ طارق میں آپ دیکھیں کہ اللہ جل جلالہ نے آسمان کا ذکر فرمایا اور پھر طارق ایک ستارے کا ذکر ہے پھر آپ علیہ السلام انہیں قرآن کریم سے نصیحت فرمارہے ہیں کہ کوئی ایسی جان نہیں مگر کہ اس پہ ایک نگہبان ہے جو اس کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی اچھائیاں اور برائیاں لکھ رہا ہے، اس کے رزق اور اس کے موت کی مدت کو دیکھتا ہے۔

چونکہ سرداری نظام تھا ہر ایک یہاں امیر بھی تھا تو ایسی حکمت عملی سے اللہ کے کلام میں سے نصیحت فرمائی گئی۔ پھر ان کے اندر تو تکبر کی بیماری تھی جو ان کے اندر (Racism) تھا اس کو زچ و مسترد کرنے کے لئے اس کریم ﷺ نے اپنے رب کا فرمان پڑھا کہ انسان کو اپنی پیدائش پہ غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ وہ کیا تھا پھر اس کی پیدائش کے پروسیجر کو واضح کیا گیا کہ صلب مرد و ترائب عورت سے نکلے ماء دافق سے تم پیدا ہوئے ہو۔ تمہیں کیا معلوم خدا کیا شان والا اور قادر مطلق ہے۔ تم تو ان بے جان صنم کے پرستار ہو جو اپنے تئیں مکھی بھی نہیں اڑا سکتا، وہ اللہ ایسا قادر و قدیم، مالک و کریم ہے کہ وہ اس انسان کی تخلیق کے بعد اسے اسی طرح واپس فرمانے پر قادر ہے، قیامت کے دن سب کے سامنے سرائر[5] (نماز، روزہ اور غسل جنابت) کی خبر لی جائے گی۔ کیا تم نے پاکیزگی قائم رکھی؟ نماز ادا کی؟ روزہ رکھا؟ اور قیامت کے دن کوئی قوت روکنے کے لئے نہیں ہوگی اور نہ ہی کوئی مددگار۔ یہ ایسے لوگوں کے سامنے آیات پڑھی جارہی ہیں جو تکبر میں بھرے ہوئے ہیں جو کسی کو اپنے سے اونچا نہیں سمجھتے، جو باقی عرب میں بڑا قدر رکھنے والے کعبہ کے قبیلہ سے ٹکر رکھنے والے ہیں۔ جو یہاں لات بت کو اسی طرح سمجھتے ہیں

جس طرح مشرکینِ قریش کعبہ اور ہُبل کو سمجھتے ہیں۔ ان کو اللہ کی توحید بیان ہو رہی ہے اور ایسے زبردست دلائل کے ساتھ جو ان کی اپنی طبیعت اور مزاج پہ جا لگتے ہیں۔

پھر ان کی معاشیات کو دلیل بنا کر اللہ کی توحید کا ذکر ہوتا ہے کہ اس آسمان اور رات کو آنے والے کی قسم جو ہر سال بارش لاتا ہے اور اس میں اپنے وقت اور مقدار معین سے سورج، چاند، ستارے گردش کرتے ہیں، پھر فرمایا گیا اس آسمان کی بارش اور سورج کی شمسی توانائی سے جو زمین میں کاشت ہوتی ہے تو اس نباتات والی زمین کی قسم یہ جو بھی بیان ہوا حق ہے کچھ بھی اس میں سے باطل اور کھیل کی بات نہیں۔ یہ کچھ چالیں چلیں گے، اور میری ایک تدبیر ہے جو میں کروں گا، تو آپ (میرے محبوب ﷺ) کافروں کو چھوڑیں کچھ مہلت دیں۔ (کہ ان کے ساتھ قتال بھی ہو گا، بدر تک مہلت دیں۔)[6]

آپ علیہ السلام نے ان کو جب کلام الٰہی مضبوط قلعہ سے بھی زیادہ ثابت برہان کے دلائل سے دعوت دی تو ان کے تکبر کے بتوں کی کمر ٹوٹ گئی اور ان کو اپنی یہ خسیس سرداری جو ان کی نظر میں سب کچھ تھی خطرے میں محسوس ہوئی۔ چونکہ وہ اس وقت اس تخت پہ بیٹھے تھے انہوں نے اتنا معتبر کلام سنا تو اپنی قوم پہ خوف زدہ ہوئے کہ وہ بھی نہ ایسی توحید کی باتیں سن کر ہمارے خلاف ہو جائیں۔ اس لئے انہوں نے وہاں ایک رذیل حرکت کی اور طوفان بد تمیزی برپا کیا۔

طائف میں جو آپ کا منہج واسلوب رہا ہے اس میں آپ دعوت کے لئے خود اس خطہ میں تشریف لے گئے تو یہ ایک عام طور پہ بھی دیکھا جائے کہ اگر کوئی آپ کے پاس تشریف لے آتا ہے تو اس کا بھرم رکھا جاتا ہے اور جب وہ مہمان ہے تو اس کو عزت واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ عرب کے ہاں تو اس کا اہتمام بہت ہی زیادہ تھا ایک مثال عقبہ بن ابی معیط کی ہے یہ شخص بے حیائی اور خبث باطنی میں سب سے آگے تھا اور آپ علیہ السلام کا پڑوسی تھا آپ ﷺ نے اس کو شریر پڑوسی کہا ہے، حضور علیہ السلام اس کے پاس اکثر تشریف لے جایا کرتے تھے اور تبلیغ بھی فرماتے۔ ایک مرتبہ یہ کسی سفر سے لوٹا تو اس نے ایک دعوت کا اہتمام کیا جس میں تمام سرداران اور رؤساء کو کھانے کی دعوت دی۔ اس میں حضور علیہ السلام کو بھی دعوت دی تو حضور علیہ السلام نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا: جب تک تم لا الٰہ الاّ اللہ کی گواہی نہ دو گے میں تمہارا کھانا نہیں کھاؤں گا۔ عقبہ نے اسی وقت کہا! اشھد اَنْ لّا الٰہ الاّ اللہ و اشھد انک رسول اللہ، دعوت کے بعد لوگوں نے پوچھا کہ تم مرتد ہو گئے؟ اس نے کہا بخدا نہیں! بات دراصل یہ ہے کہ ایک شریف میرے گھر تشریف لائے اور میرا کھانا نہ کھائے صرف اس وجہ سے کہ میں کلمہ پڑھوں، مجھے شرم محسوس ہوئی کہ میرے گھر سے کوئی کھانا کھائے بغیر چلا جائے اس لئے فقط زبان سے کلمہ پڑھا میرے دل نے تسلیم نہیں کیا۔[7] یہ تو عرب مہمان کی اتنی عزت کرتے تھے تو طائف کے سیاہ لوگوں نے جو اس وقت کیا وہ بہت سی باتوں میں عرب کی ان رسومات کے بھی خلاف گئے اور عام طور طریقہ کو بھی مسترد کر دیا۔ پھر آپ نے وہاں نہ

کہ فقط رئیسوں سے ملاقات کی بلکہ ہر ایک قبیلہ و قوم اور گھر میں تشریف لے گئے ہر ملنے گزرنے والے کو تبلیغ فرمائی ہے۔

عصر جدید میں کار دعوت کی دشواریاں اور مشکلات کا ایک موازنہ

دین اسلام فطری، ابدی اور آفاقی دین ہے اس دین نے کار دعوت کا آغاز عالمگیر حیثیت سے کیا ہے۔ عصر جدید میں فریضۂ دعوت اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ پہلے تھا۔ نوعیت، احکام اور گفتگو میں تبدیلی آسکتی ہے لیکن اس دعوت کی اہمیت اور فرضیت میں کسی قدر بھی کمی واقع نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ یہ فریضہ رب العالمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کو کتاب اللہ ہدایت للعالمین کے ساتھ دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتا ہے: ﴿فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَمِنْكُمْ مُؤْمِنٌ﴾[8] "کوئی تم میں سے کافر ہے اور کوئی مؤمن" یہ دستور الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں کفر اور اہل کفر کو بھی موجود رکھا اور ایمان والوں کو بھی بقا بخشی۔ اسی طرح اہل ایمان میں جو لوگ اس سنہری ساعتوں سے جتنا دور ہوتے گئے یعنی عہد رسالت ﷺ سے ان کا جتنا زمانی فاصلہ بڑھتا چلا گیا ایمان اتنا ہی کمزور اور ماند پڑتا گیا دل سخت ہوتے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

﴿فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ﴾[9] "پھر ان پر طویل مدت گزر گئی بالآخر ان کے دل سخت ہو گئے۔"

اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ کفر کو مٹایا جائے اور انسان کو اصل فطرت و ایمان کی طرف واپس لایا جائے اور ان کے سامنے دین کی راہ کھول دی جائے اور یہ بھی اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ اہل ایمان کی ایمانی تجدید ہو، ان کے قلوب و اذہان کی صفائی ہو اور وہ راہ ہدایت پہ گامزن ہوں۔ دعوت دین ہی سے ہدایت اور ایک نبوی معاشرہ کی بنیاد ڈالی جائے جس میں اللہ سے ڈرنے والے اور حضور سرور کونین ﷺ پہ مرنے والے لوگ ہوں۔ یعنی وہ پیارے آقا علیہ السلام کی سنتوں پہ عمل پیرا ہوں اپنی جان سے زیادہ حضور علیہ السلام سے محبت کرنے والے ہوں۔

عصر جدید میں کار دعوت

بالائی سطور میں آپ نے پڑھا کہ اس عہد میں بھی دعوت ویسی ہی ضروری اور حامل اہمیت ہے جیسی کہ عہد رسالت میں تھی۔ حضور علیہ السلام کی بعثت عالم انسانی پہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے۔ اس مبارک رسول ﷺ کی طرف سے خرابیوں میں قید سسکتی ہوئی انسانیت کو وہ نمایاں اصول عطا ہوئے ہیں جن کو اپنا کر معاشرۂ عرب نہ صرف اپنی بدحالیوں سے نکلا بلکہ انکا نصیب آفاقی ہو گیا اور ثریا پہ چمک اٹھا۔

اس بیسویں صدی میں ٹیکنالوجی خاص طور پہ سوشل میڈیا عظیم قوت بن چکی ہے۔ یوں تو اس انقلابی ترقی کے دور میں ہر شعبہ ہائے زندگی کے چھوٹے بڑے آلات ظہور پذیر ہوئے لیکن ذرائع ابلاغ، آپسی روابط اور پیغام رسانی کے عمل و تبادلے کے شعبے میں بلاشبہ حیرت انگیز ایجادات ہوئیں ہیں۔ یقیناً ہر جدید چیز کے فوائد بھی ہیں تو

نقصانات بھی، معاملات کو سدھارنے میں وہ مدد گار بھی ہے تو بگاڑ کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ سوشل میڈیا ایسا شعبہ ہے جس سے زندگی کا باقی کوئی شعبہ بچا ہوا نہیں ہے۔ چاہے وہ سیاست ہو، تعلیم، مذہب، کاروبار ہو یا پھر روزمرہ کا کوئی معاملہ ہر پہلو کو اس شعبہ نے محیط کر رکھا ہے۔ جدید ذرائع ابلاغ کی ایجاد نے اگرچہ سماجی تعلقات اور اظہارِ جذبات کے نفیس اور شائستہ طریقوں کو فراموش کر دیا ہے تاہم ان ترقی یافتہ ذرائع و وسائل کی اہمیت تسلیم شدہ ہے، جس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ دورِ حاضر میں دعوتی نقطہ نظر سے بھی یہ آلات اور وسائل نہایت اہمیت کے حامل ہیں اور اس مقصد کے لیے بڑے پیمانہ پر ان کا استعمال ہو رہا ہے۔

براہ راست بیان کی چند مشکلات

پہلی مشکل

آقا کریم ﷺ کے عہد مبارک میں ابلاغ کا جو طریقہ رائج العام تھا آپ نے وہ اختیار فرمایا کہ جب آپ علیہ السلام کو دعوت دین پہچانی تھی تو آپ علیہ السلام نے صفا چوٹی پہ چڑھ کر وہاں رائج طریقے سے سب لوگوں کو مدعو کیا اور پھر اپنا قضیہ پیش فرمایا۔ تو ہمیں یہ معلوم ہو گیا کہ جس دور میں جو ذرائع ابلاغ مہیا ہو گا اس کو ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ ذرائع ابلاغ کے ان تمام آلات کو استعمال کر کے دین کی تبلیغ کی جا رہی ہے جس میں آنلائن خطبات لائیو یوٹیوب کا استعمال فیس بک کے ذریعے براہ راست تبلیغ کرنا شامل ہے۔ لیکن اس ابلاغ و تبلیغ میں سنت کا ایک اصول چھوٹ رہا ہے وہ یہ کہ سامعین کے ذہن کو سامنے رکھ کر گفتگو کرنا یعنی گفتگو میں سامعین کے مراتب کا خیال رکھنا اور اس طرح براہ راست خطاب کرنے سے مقرر کی باتیں سامعین کے ذہن کے مطابق ہیں کہ نہیں اور سامعین کا قوت فہم مبلغ کے ذہن میں ہے یا نہیں کہ سننے والا کون ہے کیا کام کرتا ہے کتنا بات کو سمجھتا ہے؟ تو اس وجہ سے کوئی ایسی بات جو ذی فہم لوگوں کو تو سمجھ آ رہی ہے لیکن کچھ لوگ اس بات کو سمجھ نہیں پا رہے یا اس بات کو کسی اور مفہوم میں سمجھ رہے ہیں حالانکہ مبلغ اس کو کسی اور فہم میں بیان کر رہا ہے۔ تو ان تمام باتوں سے سامعین کو مختص کیا جائے یا پھر بات کو بلکل سادہ انداز میں اور وضاحت کے ساتھ بیان کرنا چاہیے تاکہ کسی فتنہ و مشکل سے بچا جا سکے۔

دوسری مشکل

اس انداز اور جدید طریقہ کے استعمال سے ایک مشکل یہ بھی درپیش ہے کہ سننے والے نے کسی باا ثر مقرر و مبلغ کی اپنی پسند کے مطابق بات کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے پھیلا دیا جس سے ایک سیدھی اور درست بات کا جو اصل مقصد تھا وہ ختم ہو گیا اور اس میں کوئی اور مقصد کی طرف بات چلی گئی اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ مختلف مبلغین کو اسی جدید طرز کے ساتھ سننے سے ان کے واعظ میں کوئی روایت حدیث مختلف الفاظ سے سننے پر سامع کے دل میں

شبہہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اب اگر وہ سامنے ہوتا یا اس کی محفل میں بیٹھا ہوتا تو اس اشتباہ سے بچ سکتا تھا لیکن اس نے اپنے کمرے میں یہ بات کئی لوگوں سے سنی اور اس شبہہ کے پیدا ہونے پر کسی سے سوال بھی نہیں کیا تو یہ بھی بہت خطرناک ہے۔

تیسری مشکل

اس طریقہ دعوت میں اب مخاطبین کی ایمانی حالت کا بھی خیال رکھنا ہوگا۔ اس سے مراد ہے کہ سامعین میں اہل کفر ہیں کہ اہل ایمان پھر ایمان رکھنے والوں میں ایمانی قوت اور توجہ الی اللہ کے لحاظ سے بہت مختلف لوگ ہیں ہر قوم کی ایک اپنی ایمانی حالت ہوتی ہے اور ہر حال کا طریقہ خطاب اور اسلوب دعوت اپنا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ تو اللہ کی الوہیت کے قائل ہی نہیں ہوتے۔ اور کچھ لوگوں کا قلب تو صرف اس ذات کے وجود و قدرت پر ایمان رکھتا ہے پھر ان کے درمیان ایمانی کیفیات اور بہت سارے درجات ہیں۔ اب ایک مقرر کو مخاطبین کی ایمانی حالات سے واقف رہنا ضروری ہے۔

چوتھی مشکل

مقرر جب براہ راست خطاب کرتا ہے تو اس کو ماحول کا پتا ہونا چاہیے کہ وہ کس قسم کے لوگوں میں دعوت دے رہا ہے اور وعظ کر رہا ہے اس ماحول میں لوگوں کی سوچ و فکر کیا ہے۔ اگر وہاں کے لوگوں کو ایمانیات بتانے کی ضرورت تھی اور مقرر نے اصطلاح حدیث پہ گفتگو شروع کر دی، یا کسی بزرگ دین کی کرامات بیان کر دیں یا پھر اس نے اللہ عَزَّوَجَلَّ کی صفات میں دستِ قدرت کی کیفیات بیان کی، دار قطنی نے یوں روایت بیان کی ہے اس عالم نے یہ کہا ہے تو یہ بات بے فائدہ رہ جائے گی۔ اس طرح کے خطاب میں یہ مشکل ہوتی ہے کہ میرا یہ بیان کوئی بھی سن سکتا ہے اور وہی بات ہو جائے گی جو "پہلی مشکل" میں ہم نے بیان کی ہے۔

سفر طائف میں دعوت کا طریقہ

طائف میں دعوت دین کا جو طریقہ کار رہا اس میں یہ تھا کہ آقا کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم نے خود جا کر لوگوں کو نصیحت فرمائی ہے۔ اور جس طبیعت و مزاج اور فہم و ادراک کے لوگ تھے ان کے سامنے اس طرح کی بات فرمائی اور دعوت دی۔ اس کے بعد جب آپ واپس تشریف فرما ہوئے ہیں تو اس میں بھی قبائل کے پاس خود تشریف فرما ہو کر انہیں دعوت دی ہے۔ سامنے مل کر وعظ و نصیحت کرنے کا اثر الگ ہوتا ہے اور براہ راست کسی جدید ٹیکنالوجی کو زیر استعمال کر کے نصیحت کا اثر الگ ہوتا ہے۔ اس لئے داعی کو چاہیے کہ وہ لوگوں سے جتنا ممکن ہو ساتھ بیٹھ کر دعوت و نصیحت کرے اور گفتگو سے قبل سامعین کے علمی معیار کی خبر لے اور ان کی دینی ضرورت کو دیکھے پھر اس ماحول سے واقفیت ہو اور ان لوگوں کی ایمانی حالت کا بھی علم ہو تاکہ وہ جتنا وقت ان کے ساتھ ہو مؤثر گفتگو کرے۔

دعوت و تبلیغ میں درپیش خارجی مشکلات

اس وقت انسانیت جس معاشی و معاشرتی ناہمواری اور روحانی تکلیف میں مبتلا ہے اس کا واحد حل صرف دین اسلام میں ہے۔ اس طرح کے جاگیر دانہ نظام (Feudalism) جو سیاسی اور معاشرتی سطح پر ہو عہد رسالت میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ طائف کے لوگ بھی بہت مالدار تھے، تو یہ Feudalism اور سوشلزم (Socialism) کے ناکام تجربات کے بعد Capitalism نے اس سسکتی انسانیت کو بربادی کے دہانے پہ کھڑا کر دیا ہے۔ اب چونکہ یہ پہلے بھی اس طرح کے کرتب ان کے گزر چکے ہیں تو ان سبھی کا حل نوع انسان کے پاس صرف اسلام ہے۔ اب مسلمان مفکرین کو مغرب کی چمک دھمک سے فرصت نہیں ملتی کہ وہ اس پر کوئی ذہانت کے گھوڑے دوڑائیں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ مسلمانوں کے اکثر وہ مفکرین جو اسلام کو عالمگیر و آفاقی دین سمجھتے ہیں وہ اس دین کو متبادل نظام کے طور پر لانے کی صلاحیت سے خالی ہیں۔ اور اب جو ہماری علمی تگ و تاز کے میدان پہ نظر ڈالی جاتی ہے تو ہم آپس میں دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ اب یوں لگتا ہے کہ جو اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور تمام انسانیت کی اس میں نجات ہے اس تصور سے ہم دستبردار ہو چکے ہیں۔ اب باقی دانشور یہ سوچتے ہیں کہ اس بارے میں صرف علماء کو ہی کچھ کرنا ہے کیونکہ دین کا علم فرض کفایہ ہے تو انہوں نے کچھ کرنا نہیں۔

سیکیولرازم (Secularism)

اس ستم ظرفی میں جس نے دعوت دین کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے وہ سیکیولرازم ہے۔ جس کو ہم لادینیت کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھ لیں جس کے بھی آخر میں (Ism) کا اضافہ ہو وہ ایک مذہب کی شکل اختیار کر چکا ہوتا ہے اس کے اندر فکری و تہذیبی ارتقاء کے نتیجے میں لازم ملزوم عقیدے اور مسلّمہ تصورات اور نظریات پائے جاتے ہیں۔ ان نظریات کی بنا پر وہ صرف ایک اصطلاح نہیں رہتا بلکہ ایک مذہب کی حیثیت اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ اب یہ مسئلہ کچھ یوں ہے کہ مغربی فکر و فلسفہ میں ان کی بنیاد عقل پر ہے اور ان کے ہاں صرف وہی چیز قابل قبول ہے جو عقلی اصولوں پر ثابت کی جائے۔ مغرب کو کسی بھی مذہب کی خصوصاً اسلام کی ان تعلیمات سے کوئی خطرہ نہیں جو کسی انسان کی انفرادی و نجی زندگی سے تعلق رکھتی ہوں لیکن جب بھی ان سے ایک نظام کی بات کی جاتی ہے تو وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے حق میں نہیں ہیں اور نہ ہی وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان نظام خلافت کی بات کریں اور اجتماعی انسانیت میں مذہب کے کردار کی دعوت دیں۔ ڈاکٹر اکرم ورک اپنے آرٹیکل میں لکھتے ہیں:

اس پس منظر میں علماء کرام پہ لازم ہے سیکولرازم کے بنیادی سوالات کا سامنا کریں۔ سیکولرازم کے بنیادی سوالات (1) انسانی حقوق (2) دین اور سیاست کا باہمی تعلق (3) مرتد کی سزا (4) آزادی نسواں (5) آزادی اظہارِ رائے (6) جمہوریت (7) جہاد (8) مذہبی رواداری اور اسی نوعیت کے دیگر موضوعات کے متعلق ہیں مغرب کے فکری چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لئے علماء کرام کے لئے ضروری ہے کہ وہ دینی احکام کے اسرار و حکم کو نئے سرے سے دریافت کریں۔[10]

داعیان اسلام کے لئے ان اسباب اور وجوہات کو تلاش کرنا بھی لازم ہے جن کے سبب مغرب میں دین سے نفرت اور دین بیزاری نے جنم لیا۔ اہل مغرب کی نفسیات کو سمجھنا لازم ہے تاکہ اگر یہ چیز ہمارے نوجوانوں میں پائی جا رہی ہے تو اس کا بروقت ادراک کر کے حل نکالا جائے۔ اور مبلغین پہ یہ بھی لازم ہے کہ تقابل ادیان کے مطالعے کے ساتھ مغربی افکار و فلسفے کا تجزیاتی مطالعہ کریں تاکہ ان کی اصولی غلطیوں کو واضح کر سکیں۔

مغربی دلدل (Marsh of West)

انسان کے متعلق مغربی فکر اور تصورات ماسوا دو چیزوں کے اور کچھ نہیں ان کے نزدیک انسان کا ایک مقصد یہ نکلتا ہے کہ پہلا: دنیا کے وسائل کا جتنا استعمال ہو سکتا ہے کیا جائے اور ان وسائل میں ژرف نگاہی سے کام لے کر کے کثیر دولت جمع کرنا اور دوسرا: اس دولت اور سامان عیش سے لطف اندوز ہونا۔ اب یہ اس لئے بھی ہے کہ ان کے پاس تصورِ آخرت نہیں ہے اور اسی بنا پر وہ اس دنیا کو سب کچھ سمجھتے ہوئے انسان کا تخلیقی مقصد ان دو مادی اشیاء پر ہی مبنی سمجھتے ہیں اور باقی کام اسی کے ضمن میں ہیں جیسے اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرنا، صحت و تندرستی کو برقرار رکھنا تاکہ ان سب کے ذریعے جسم وسائل کو استعمال کرنے میں مہارت حاصل کر سکے پھر یہ جسم ان چیزوں سے لطف اندوز ہو کر تفریحات کا متحمل ہو سکے۔ مغرب کی اس فکر میں مبتلا ہونے کی وجہ ان کا ذریعۂ حصول علم ہے۔ کہ ان کے نزدیک حواس خمسہ کے ذریعے عقل میں آنے والی چیز ہی یا دوسرا Empirical evidence تجرباتی طور حاصل کئے ہوئے ثبوت ذریعہ علم ہیں۔

مسلمان معاشرے کے اندر یہ تصورِ انسان بڑی ہی تیزی کے ساتھ داخل صف ہو رہا ہے۔ اس میں سب سے بڑا جو کردار ہے وہ جدید ٹیکنالوجی میں سے سوشل میڈیا کا ہے جس کے ذریعے لوگ اپنی نجی زندگی کو تمام انسانوں کے لئے عام کر رہے ہیں۔ پھر اپنی زندگی کے سامان تعیش کو استراحت کے لئے استعمال کر کے اذہان عوام میں وہی مغربی دلدل کی فکر پختہ کر رہے ہیں کہ انسانی وجود کا مقصد پہلے ڈھیر سارا مال و دولت جمع کرنا ہے پھر اس دولت سے لگژری (Luxury) زندگی کے سامان تعیش سے لطف اندوز ہونا ہے۔ مسلمان بچوں کے ذہن میں اس بات کا آنا بہت ضروری ہے کہ یہ دونوں چیزیں فی نفسہ تو جائز ہیں لیکن یہ اس وجودِ امانت کا تخلیقی مقصد نہیں ہیں۔ اب اس دلدل میں پڑنے سے لوگوں کے ذہنوں میں مغرب کی طرف سے بتائے اصول راسخ ہو رہے ہیں۔ مغربی تہذیب سے جن انسانی حقوق کا بتایا جا رہا ہے وہ سارے حقوق بھی عقل کی بنیادوں پہ باندھے گئے ہیں۔ پھر ان کی نظر میں طیّب اور خبیث کی تمیز ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے لئے اچھا وہ ہے جو اس کی ذات کو اچھا لگتا ہے۔

اس طرح مغرب نے اقتدار اور جاہ منصب کو انسانی حقوق کی فہرست میں داخل کیا تو لوگ اس دوڑ میں بھاگے چلے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکمرانوں میں خود پرستی، نفس پروری، خود غرضی اور ہوس پرستی کی بھیانک صورت نظر آئی اور اس اقتدار اور اسٹیٹس کی طمع میں حکمران گھوڑوں کی نالوں تلے عوامی حقوق کو روندے چلے گئے، اس کے

حصول کے لئے ہر جائز و ناجائز حربہ کو زینہ بنالیا۔ اب اس عقل کی بنیاد پر جو بھی اصول انہوں نے طے کئے ہیں ان اصولوں میں اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ جو انہوں نے آج اصول بنائے ہیں وہ کل بھی تسلیم کئے جائیں گے کیوں کہ انسانی عقل عاجز ہے اور اس کی بنیادوں پہ کوئی فیصلہ حرف آخر قرار نہیں دیا جاسکتا۔

اس حساب سے عقل مردود نہیں بلکہ محدود ہے اور مغرب کی طرف سے آج جو تصورات پھیلائے جارہے ہیں ان کا نتیجہ معاشرے میں بگاڑ، جنسی ژولیدگی اور خاندانی نظام کی تباہی ہے اور یہ بھیانک نمونہ خود مغرب کے لئے حیران کن ہے اور مغربی دانشور خود ششدر میں مبتلا ہیں۔ ان تمام حقائق کے پس منظر میں جب کوئی متبادل نظام کی بات کرتا ہے تو یہ بات نور آفتاب کی طرح عیاں ہے کہ اسلام کا جو دیا گیا نظام ہے جو بات اللہ کے محبوب ﷺ نے اپنے عہد ظاہرہ میں وحیٔ الٰہی سے پیش فرمائی جو انسانی حقوق و فرائض کے تعین و تحفظ میں خط امتیاز ہادیٔ امت ﷺ کی تعلیمات سے واضح ہوا عقلِ انسان اتنے تدریجی و ترقیاتی مراحل طے کر کے بہت سارے تجربات کے بعد بھی اس نظام مصطفی ﷺ کا متبادل نہیں لاسکی۔ اس کی سب سے خاص اور امتیازی وجہ علم کی بنیاد اور اصل وحیٔ الٰہی کو ماننا ہے۔ اگر ہمیں اپنی حالت کو ہر طبقۂ فکر میں بلند کرنا ہے تو اپنے کانسٹیٹیوشن (Constitution) میں لکھی اس حقیقت پہ ہر حال میں عمل کرنا ہوگا:

> “Sovereignty over the entire universe belongs to Allah Almighty alone” (11)

(صرف پاکستان کا نہیں بلکہ) تمام عالمین کا حاکمِ اعلی صرف اور صرف اللہ جل جلالہ ہے۔

لیکن مغرب نے وحیٔ الٰہی کی اس جگمگاتی روشنی کو سرچشمۂ حیات سمجھنے کے بجائے عقل کو اپنے نظام کا نگران مقرر کیا۔ اور اس کے نتائج پہ غور نہ کیا کے خواہشات کے گھوڑے کا لغام عقل کے سنبھالنے سے رہا اور ہمیشہ یہ محدود ذریعہ علم (عقل) اس میں ناکارہ و ناکام ثابت رہے گا۔

داعیان اسلام کے لئے لازم ہے کہ مغرب کی ان تمام خرابیوں کو اچھی طرح جانے اور اس کے متبادل میں یہ اپنے نظام انسانیت سے بھی واقف ہوں جو ہمیں بارگاہ مصطفی ﷺ سے وحیٔ الٰہی کا فیض نصیب ہوا ہے۔ اور اس جدید دور کی یہ مشکلات جو سوشل میڈیا کے ذریعے امت کی فکری صلاحیتوں کو ناکارہ کررہی ہیں اور انسانی وجود کے مقاصد میں مغربی فلسفہ کو داخل صف کررہی ہیں ان کا سد باب کرنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد اپنا تزکیہ کرنا ہے اور کتاب مقدس کو سیکھنا ہے انسان اپنی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ انسانی فریضے کی انجام دہی کی طرف بھی توجہ دے۔ انسان کے بنیادی فرائض کو اگر دو سطور میں بیان کیا جائے تو وہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی بندگی کرنا ہے اور مخلوق خدا کے حقوق کی ادائگی اور ان سے حسن سلوک رکھنا ہے۔

زبان کا مختلف ہونا

اس بات کو بھی مد نظر رکھنا لازم ہے کہ دعوت و تبلیغ کے لئے ہمیں خارجی مسائل میں ایک مسئلہ زبان (بولی) کا پیش آتا ہے۔ عہد رسالت مآب ﷺ کو جب ہم دیکھتے ہیں تو آپ بین المذاہب یا دیگر اقوام کو دعوت و تبلیغ کرنے کے لئے مختلف صحابہ کو اس قوم کی زبان سیکھنے کا حکم فرمایا۔ یہ اس لئے تھا کے دعوت کے اندر قوت اور تاثیر اس وقت پیدا ہو گی جب مخاطب اور مبلغ کی زبان ایک ہو گی۔ ہم زبان ہونے سے کلام کرنے والوں کے درمیان ایک اپنایت پیدا ہوتی ہے، اجنبیت دور ہوتی ہے، مقاصد گفتگو سمجھانے میں آسانی پید ہو جاتی ہے۔ اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں حضور علیہ افضل الصلاۃ والتسلیم نے سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو سریانی زبان سیکھنے کا حکم ارشاد فرمایا اس طرح حضرت سلمان رضی اللہ عنہ فارسی زبان جانتے تھے انہوں نے نو مسلم ایرانیوں کو سورہ فاتحہ کا حضور علیہ السلام کی اجازت سے ترجمہ کر کے دیا تھا۔[12] اس طرح جو آقا کریم علیہ السلام نے بادشاہوں کی طرف خطوط لکھے تو یہ سلسلہ بھی اسی زبان کی بنیاد پہ ہوا۔[13] اس طرح کے بہت حوالے سیرت طیبہ سے مل جاتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے لئے قوموں کی زبان، ان کا رہن سہن، ان کی نفسیات، ان کی ثقافت ہر چیز سے واقفیت ہونی چاہیے۔

عہد حاضر میں یہ کمی شدت سے محسوس ہوتی ہے ویسے تو پورے عالم اسلام میں گنتی کے برابر صفات مجتہدین سے مامور علماء ملتے ہیں اور اس پر گفتگو بھی ناگفتہ ہے پر اگر ہم پاک و ہند کے مسلمان علماء کا طرز عمل دیکھیں تو صورت حال بہت ہی سنگین نظر آتی ہے۔ اٹھارہ انیس سو کے بیچ والی جنگ کے بعد جو قیادت اسلام نے نصاب تعلیم بنایا وہ صرف اسلام اور ایمان بچانے کے لئے کافی تھا اس وقت مدارس میں یہ نصاب حفاظتِ ایمانی کے بنیادی مقصد کے تحت رائج کیا اور پڑھایا گیا تھا تاکہ اس خطہ کو ترکی یا اندلس جیسا بننے سے بچایا جا سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کی قربانیوں نے اس ایمان کی حفاظت میں کامیابی حاصل کی اور محبت مصطفی ﷺ سے دلوں کو جلا بخشی۔ لیکن جب اللہ عزوجل نے ایک بہت بڑی جد وجہد کے بعد آزادی کی نعمت سے نوازا تو اس تعلیمی نصاب میں جس تبدیلی کی ضرورت تھی اس کی طرف توجہ نہ دی جا سکی۔ جس کے نتیجہ میں آج شدت سے ان علماء کی کمی محسوس ہوتی ہے جو اس پیغام دعوت کو اس محاورے اور پیراڈائم (Paradigm) میں پہنچا سکیں۔ اس دعوت کو پہنچانے میں جو سب سے زیادہ ایک ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ ایسا فہم رکھنے والے علماء کی بھی ہے جو بین المذاہب ہم آہنگی (Inter Faith Dialogues) کے اصولوں سے واقف ہوں۔ ایک داعی اسلام کے لئے حضور علیہ السلام کی مکی و مدنی زندگی کا اس نقطہ نگاہ سے مطالعہ از حد ضروری ہے۔ خصوصاً سفر طائف میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ آپ علیہ السلام نے کس طرح وہاں کے لوگوں سے بات کی ان کے رہن سہن سے واقفیت بھی رکھتے تھے اور زبان سے بھی پھر ان کے عام لوگوں میں تبلیغ کا طریقہ کیا رہا اور رئساء میں کس طرح انداز رکھا۔ پھر دور حاضر میں

اگر اسلام کی دعوت دینے والے جدید نظام معیشت، قوانین عالم، سیاست اور مغربی فلسفہ سے آشنا نہیں ہیں تو ان کا دائرۂ دعوت صرف مسلم معاشروں تک ہی محدود رہ جائے گا۔

دعوت دین میں درپیش داخلی مشکلات

علمی تراث سے لاعلمی

قوموں کے عروج و زوال کا ایک بنیادی سبب علم اور اخلاق ہے۔ اسلامی تعلیمات میں وحی کی ابتدا بھی "اقرأ" جیسے بابرکت لفظ کے ساتھ ہوئی ہے۔ مسلمانوں کے عروج وترقی کا ایک سبب علم و تحقیق میں اہم کردار ادار کرنا ہے۔ تاریخ کی یہ بات صریح گواہ ہے کہ مسلمانوں نے علمی و تحقیقی میدان میں اپنے عہد کے متمدن تہذیبوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے، اور ان علوم کے اندر ایسی ایجادات اور تھیوریز (Theories) پیش کیں جو پوری انسانیت کی اجتماعی ترقی کا باعث بن گئیں۔ 1258ء تک مشرق و مغرب میں مسلمانوں کے ایجاد کردہ علم وفنون کا ارتقائی عروج تھا، ان تحقیقات کے نتیجے میں باقی خطوں کے ساتھ خصوصاً مغرب نے علمی وفنی میدان میں مسلمانوں سے بہت استفادہ کیا۔ سکوت بغداد کے بعد علمی، ذہنی ترقی دریا کے نذر ہوگئی اور بہت سارے مفکرین اور نامور علماء بھی تاتاری تلواروں تلے آگئے۔ پھر جب 1492ء میں غرناطہ کا معاملہ ہوا تو فکر مسلم کے تمام سرچشمے خشک ہوگئے۔ اب یہاں سے اجتہاد کے دیپ کو تقلید کی فضائوں نے بجھا دیا۔ اس طرح یہ علمی (پریکٹیکل) روایت مغرب کی طرف منتقل ہوگئی اور اس عروج کو اس طرح تنزلی نے زوال آشنا کیا۔

علماء کرام کے لئے ضروری ہے کہ حالات حاضرہ میں وہ علمی اختلاف رائے کو علمی حد تک محدود رکھیں اور متقدمین کے ساتھ ساتھ دور جدید کے نامور علماء اور شخصیات کے افکار کا مطالعہ کریں، اس جدید ٹکنیکل دور میں اس کی سائنس کو سمجھیں اور اس کے بھیانک نتائج کو جانیں، اس کے ساتھ اپنے علمی تراث سے وابستہ رہیں کہ ماضی میں کتنی جلیل القدر شخصیات مسلم مفکرین گزرے ہیں جن کی فکر کو غیروں نے اپنایا ہوا ہے۔ پھر ہی کچھ ممکن ہے کہ اپنے اس عروج کو یہ شاہین پہنچ سکے۔

عزت وتوقیر کی بحالی

ہر عہد میں علماء کرام کو معاشرے کے اندر عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ علماء کرام واقعتاً ہمارا علمی اثاثہ ہیں اور یہ کہنا کوئی غلط نہ ہوگا جیسے وباء کے حالات میں طبیب سے دوری جان لیوا ہے اسی طرح فتنوں کے حالات میں علماء سے دوری ایمان لیوا ہے۔ عہد جدید کی بات کی جائے تو اسی ٹیکنیکل مشکلات نے انسان کے اندر سے مادہ عفوودرگزر کو ختم کر دیا ہے۔ اب انسان کی غلطیوں پہ پردارکھنے کے بجائے اس کو تمام لوگوں کے سامنے رکھا جا رہا ہے اور ان سب باتوں میں ایک بات تعصب اور حسد کی بھی شامل ہے۔ اب ان چھوٹی چھوٹی باتوں سے معاشرے کے اندر بڑی بڑی خرابیوں نے جنم لے لیا ہے۔ علماء کرام اس جدید چکروں میں اپنی ساکھ خراب کر رہے ہیں۔ بیان

کردہ مسائل کے تحت اب زمینی حقائق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علماء کا معاشرے میں اب وہ مقام نہیں رہا جو مقام سلف میں موجود تھا، ماضی میں مولوی، مولانا، علامہ یہ القاب اس شخصیت کا علمی قد بیان کرتے تھے، اب اس جدید عہد میں یہ القاب اپنی قدر و قیمت کھو چکے ہیں۔ اب لوگ ان القاب سے پرہیز کرتے ہیں اس کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک نااہل لوگوں کا برسرِ القاب ہونا ہے۔ جیسے نیم حکیم خطرہ جان ہوتا ہے اسی طرح نیم ملا خطرۂ ایمان ہوتا ہے۔ تو کم علم و فہم اور نااہل لوگوں نے جب اتنے قیمتی القاب اپنے سروں پہ سجالئے تو اس کھوکھلے پن نے ان معزز و باوقار القاب کی قدر و قیمت کو ضایع کر دیا۔ اب بہت سارے حقی مولوی بھی ان القاب سے پرہیز کرتے ہیں کہ معاشرے میں لوگ ان القاب والی شخصیات کو ایک الگ نظر سے دیکھتے ہیں۔

اس خرابی کی دوسری وجہ بلکل عہد جدید میں سیاسی گھرانوں کی طرح ملتی ہے۔ جیسے یہ سیاسی لوگ سیاست کو صرف اپنے گھر کی میراث سمجھ کر کسی اور کو کچھ نہیں سمجھتے، بھلے ہی اپنے اندر سیاست کی کوئی صلاحیت موجود نہ ہو۔ اسی طرح مذہبی گھرانوں میں جو خاندان مستقل مذہبی شناخت رکھتے ہیں اس میں ایسے لوگوں اور سجادہ نشینوں نے جنم لے لیا، جن کا بچپن خواب خیالوں میں، جوانی موج اور من مانی مقبولیت میں گزری۔ اور جس خاندان سے لوگ علمی اور روحانی غذا حاصل کرتے تھے اب وہاں عوام الناس کو نااہلی کے سبب استیصال ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ کوئی ذاتی صلاحیت نہیں بس خاندان و بزرگوں کی اولاد ہونے کے باعث ممبر و محراب کے وارث بن گئے گدی نشین بن گئے۔ حقیقی سجاد کے مجازی سجادہ نشین بن گئے۔ بقول علامہ محمد اقبالؒ ؎

میراث میں آئی ہے انہیں مسند ارشاد زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

ہر معاشرے میں صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے والے لوگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ اب اس کشمکش میں دعوت دین کو خاندانی پیشہ اور کاروبار کے طور پر اختیار کرنے کے نتیجہ میں عوامی سطح پر دیکھا جائے تو لوگ اعتدال کے بجائے علماء حق کو بھی اسی زمرے میں ڈال دیتے ہیں اور لوگوں کی نظر میں دونوں فکر کے لوگ یکساں ہو جاتے ہیں۔ وہ علماء کرام جنہوں نے اس فریضہ کو اپنا دینی فریضہ سمجھ کر ایک مشن کے طور اختیار کیا ہے اور نیک نیتی و اخلاص کے ساتھ کام کر رہے ہیں دیکھا جائے تو ایسی شخصیات بھی بڑی تیزی کے ساتھ دائرہ اثر سے کم ہوتی جا رہی ہیں۔

عمومی طور پر جو ابلاغ و تبلیغ کے موضوعات علماء کرام سے سننے کو ملتے ہیں وہ کسی کی وفات، عرس یا شمائل و فضائل پہ مبنی ہیں۔ یا اگر دوسری طرف دیکھا جائے تو ایسے موضوع سننے کو ملتے ہیں جو زمانی و مکانی حدود میں قید ہیں کہ فلاں صاحب نے فلاں سے ہاتھ ملایا تھا اب اس پورے خطہ ارض کے بسنے والوں کو اس خِطۂ ارض والوں کے سامنے اعلانیہ رجوع کرنا ہو گا۔ اس طرح کے موضوعات نے علماء کرام کی عزت و وقار کو عوام الناس میں بے اثر کر دیا ہے اب اس میں کتنے بھی القاب سجائے جائیں وہ سارے بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

موضوعات کی ہی بات کی جائے تو علماء کی عزت میں کمی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ ایک طرف ہمیں تبلیغ کے اندر بتایا جاتا ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات ہے۔ تو اس پوری حیات کے ضابطے میں نظام زندگی بسر کرنے کے تمام موضوعات شامل ہونے چاہئیں جیسے معاشی، سیاسی، معاشرتی، اور اخلاقی لیکن ایک کثیر تعداد فاضلین کی ایسی ہے جو ان موضوعات سے ناآشنا ہے۔ ان کے اندر عصری تناظر میں گفتگو کرنے کی اہلیت کم پائی جاتی ہے۔ اس نقصان میں دونوں (جدید تعلیمی ادارے اور روایتی دینی مدارس) یکساں ہیں۔ جدید تعلیمی اداروں میں باقی علوم پر جتنی توجہ اور مہارت دکھائی جاتی ہے اس سے دگنی کمزوری دینی علوم کو سکھانے میں دکھائی جاتی ہے، اسی طرح مدارس میں علوم اسلامیہ کو جتنا عمق و توجہ سے پڑھایا جاتا ہے اتنی توجہ عصری علوم (جدید معاشرت، عمرانیات، سیاست، عالمی قانون، مغربی فکر و فلسفہ) پہ نہیں دی جاتی۔ اور ان دینی مدارس میں قدیم نصاب کو قدیم تدریسی انداز میں پڑھایا جاتا ہے جس میں مناظرانہ تدریسی انداز سرفہرست ہے۔

ان کے علاوہ بھی کچھ اسباب ہیں جن سے علماء کا وقار لوگوں کے نزدیک کم ہوتا جارہا ہے اور فریضہ اشاعت و تبلیغ میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ حالات حاضرہ سے پہلے ایسا نہیں تھا علماء کی لوگ قدر کرتے تھے ان کی بات سنتے تھے کہ انہوں نے اپنی شخصیت میں اخلاص رکھا اور دین کا کام دین سمجھ کے کیا۔ اس کام کے لئے انہوں نے خود کو اس کا اہل بنایا اور بنی بنائی مسند پہ جلوہ گر نہیں ہوئے۔ وہ سب سے پہلے مسائل کے حل کرنے میں قرآن کریم سے فیض حاصل کرتے تھے پھر سنت میں اس کا حل تلاش کرتے اور پھر جو اصول ہیں۔ اس وقت ہمیں بھی پہلے قرآن و سنت میں غور و خوض کر کے پھر اس پر اپنے اکابر کے اقوال کو دیکھنا چاہیے تاکہ اس قرآن کریم و سنت میں غور و خوض کی برکت سے محروم نہ رہ جائیں قرآن و سنت میں نظر پھیرنے سے شرح صدر ہوتا ہے انوار الٰہی متوجہ ہوتے ہیں یہی ایک طریقہ اور حل ہے۔

فکر معاش

دنیا کا ایک فطری دستور ہے کبھی بھی کوئی افکار، نظریات، تصورات یا مذہب روح اور بدن میں سے ایک کو ابھارنے اور دوسرے کو ختم کرنے سے کامیاب نہیں ہوتے۔ اور یہ امتیاز صرف دین اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے روح اور جسم دونوں کی ضروریات کو پیش نظر رکھا اور ان دونوں کا حق بتایا۔ اب اس دین کی تبلیغ میں ایک بڑی مشکل معاش کی بھی ہے۔ اور اس معاش کے مسئلے کی اہمیت سرکار دوعالم ﷺ کے اس فرمان سے معلوم ہوتی ہے کہ فرمایا:

كَادَ الفَقْرُ اَنْ يَّكُونَ كُفْراً [14]

قریب ہے کہ تنگدستی کفر کرنے تک پہنچادے۔

اب ایک شخص بڑے ہی اخلاص کے ساتھ دین کا کام کرتا ہے اور اس دعوت و تبلیغ کو ایک مشن کے طور پر سمجھ لیتا ہے لیکن اپنے علمی تراث سے وابستہ ہونے کو اپنی جہالت دور کرنے کو، اپنے گھر سے مدرسہ تک جانے کو، اس عہد میں قیمت کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر داعیان اسلام کو کچھ اور مسائل درپیش ہیں تو ان سب میں سب سے زیادہ جو مسئلہ ہے وہ یہی معاش کا مسئلہ ہے۔ بقول اعلیٰ حضرت امام احمد رضاؒ:

؎کانٹا میرے جگر سے غم روزگار کا   یوں کھینچ لیجئے کہ جگر کو خبر نہ ہو۔ (حدائق بخشش)

ایک بزرگ نے (اللہ ان پہ کروڑہا رحمتیں نازل فرمائے) دین کے چھے ارکان بتائیں ہیں کلمہ، نماز، روزا، زکاۃ، حج اور آخری کسب حلال اور فرمایا اگر کسی کا یہ آخری رکن رہتا ہے تو اس کے پہلے سارے ضایع ہونے کا خدشہ ہے۔ تو یہ فرمان بھی حدیث بالا کی تشریح کرتا نظر آتا ہے۔ دورِ قدیم میں مہمان نوازی کی روایت عام تھی لوگ ایک دوسرے کو وقت دیتے تھے رہائش دیتے تھے لیکن اب کسی کے پاس فرصت سلام نہیں ہے۔ اب زندگی کی اس دوڑ میں کیسے ممکن ہے کہ اسی وقت تبلیغ بھی کریں اور گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لئے معاش کو بھی سنبھالیں دونوں چیزوں کو وقت کی ضرورت ہے۔

عرف عام سے لاعلمی

عہد جدید میں ایک تبلیغی مشکل یہ بھی ہے کہ داعیان اسلام کو عالمی عرف سے ناواقفیت ہے۔ ایک تو علاقائی عرف اس کا بھی احترام کرنا ہے۔ دوسرا کیوں کہ دین اسلام تمام انسانیت کے لئے ہے تو عالمی عرف کو بھی جاننا بہت ہی ضروری ہے۔ اب سوال اٹھتا ہے کہ اس طرح کی کوئی بات سیرت طیبہ میں موجود ہے یا نہیں تو اس کے لئے صرف دو باتیں یہاں نقل کروں گا جہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ کے لئے عرف کا جاننا بھی اہمیت کا حامل ہے۔ سیرت طیبہ میں ایسی بہت سی مثالیں ملتی ہیں جہاں مالک کونین ﷺ نے اپنے موقف پر قائم رہتے ہوئے بین الاقوامی عرف اور قبائلی رسوم کا احترام کیا ہے۔ سن 9 ہجری میں بنو تمیم کی قیادت کرتے اقرع بن حابس (رضی اللہ عنہ) اپنے وفد کے ساتھ بارگاہ رسالت مآب میں آئے انہوں نے اسلام قبول کرنے کے لئے ایک مقابلہ کی شرط لگائی اب یہ بھی ایک رواج تھا انہوں نے کہا کہ ہم اس وقت اسلام لے آئیں گے جب آپ کا خطیب ہمارے خطیب سے اور آپ کا شاعر ہمارے شاعر سے مقابلہ جیت لے۔ (اب یہ ایک رواج تھا اگر اس میں مسلمانوں کی طرف سے مقابلہ کوئی نہ جیت پائے تو قطعاً یہ مطلب نہیں کہ دین اسلام حق نہیں) تو آپ علیہ السلام نے اس کی رعایت رکھتے ہوئے مسلمانوں کی طرف سے حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو شاعر اور ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کو خطیب نامزد فرمایا۔ بنو تمیم کی طرف سے شاعر زبرقان بن بدر اور خطیب عطارد بن حاجب نے مقابلہ کیا، مقابلے میں بالآخر حضور علیہ السلام کے غلاموں کی برتری تسلیم کرتے ہوئے بنو تمیم نے اسلام قبول کر لیا۔[15] اب دیکھا جائے تو یہ مطالبہ لایعنی تھا لیکن آپ علیہ السلام نے ان کے رسوم کا احترام فرمایا۔

ایک اور عالمی عرف کی بھی مثال سیرت طیبہ سے ملتی ہے کہ جب خاتم النبیین مصطفی کریم ﷺ کا مسیلمہ کذاب کے سفیروں سے مکالمہ ہوا تو آپ نے ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مسیلمہ کو نبی مانتے ہو؟ انہوں نے ہاں میں جواب دیا۔ ان کے اس جواب پہ آپ علیہ السلام نے یوں فرمایا: "لَوْ كُنْتُ قَاتِلًا رَسُولًا لَقَتَلْتُكُمَا" اگر میں سفیروں کو قتل کرنا جائز سمجھتا ہوتا تو میں تم دونوں کو قتل کر دیتا۔(16) عالمی قانون کا لحاظ رکھتے ہوئے آپ علیہ السلام نے سفیروں کو جانے دیا۔

داعیان اسلام کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ عالمی عرف و قانون سے وابستہ ہوں۔ جب خطوط کے ذریعے آپ علیہ السلام نے تبلیغ فرمائی تو عالمی رواج کے مطابق اس پر مہر ثبت کرنے کے لئے ایک انگوٹھی بنوائی کیونکہ بغیر مہر کے امراء وحکام خط قبول نہیں کرتے تھے۔ ایک داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ عائلی قوانین، UDHR (Universal Declaration of Human Rights) "انسانی حقوق کا عالمی منشور" سے، IHL, IHRL سے آشنا ہو۔ ان تمام عالمی عرف اور بین الاقوامی معاہدات کے مثبت مطالعہ و تجزیہ سے عالمی سطح پر دین کی اشاعت و تبلیغ کا کام کرنا مزید آسان ہو سکتا ہے۔

جزوی مشکلات عہد حاضر میں

عہد سیرت میں دعوت و تبلیغ کی جو مشکلات تھیں ان کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی کچھ جزئیات عہد جدید میں بھی ہمیں ملتی ہیں۔ ان میں سے ایک انسانی طبع سے متعلق ہے۔ گزشتہ چند دہائیوں سے انسانی طبع کے اندر ایک خاص قسم کا تنوع آگیا ہے کہ یہ انسان اب خود کو محدود اور محفوظ کرنے لگ گیا ہے۔ یہاں محفوظ باقی لوگوں کی باتوں اور ان کے معاملات سے ہے۔ اب یہ چاہتا ہے کہ جس طرح میں کسی کو ان کی زندگی کے متعلق نہیں کہتا تو ان لوگوں کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ مجھے نصیحت کریں۔ دوسری طرف یہ سوچ بھی گرداں ہے کہ یہ ان کا معاملہ ہے میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔ اس سے مذہبی زندگی کے ساتھ اخلاقی زندگی میں بھی نقصانات آنے لگے ہیں۔ ان تصورات سے سیاسۃ المدنی اور سیاسۃ البیت پر بہت گہرا اثر پڑا ہے کچھ اس طرح کہ پہلے گھر کا بڑا اپنی اولاد کے ساتھ بھائی کی اولاد ماموں کی اولاد بہن کی اولاد یا کوئی بڑا کسی بھی رشتہ دار کو جو سیکھنے کے مراحل طے کر رہا ہے نصیحت کرتا تھا بسا اوقات ڈانٹ بھی لگاتا اور ضرورت پڑنے پر پٹائی بھی کر لیتا تھا لیکن اب یہ ہے کہ ہر کوئی اس بات میں محدود ہو گیا ہے کہ یہ اب بھائی کی اولاد ہے تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ خود جانے۔ یہ تصور جب رشتہ داری میں آگیا تو پڑوسی کو سمجھانے اور نصیحت کرنے کی بات اس سے بھی آگے ہے۔

اب معاشرے میں ہر کوئی محدود زندگی میں چل رہا ہے۔ کچھ رسوم ہیں جو ادا کرنے کے لئے آجاتا ہے ورنہ اس کا اختیار صرف اپنے خاندان تک ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اس کے جو بھی معاملات ہوں اچھے ہوں یا برے اس کے اپنے فیصلے ہیں کسی کو حق نہیں بنتا کہ وہ اس کو نصیحت کرے اور یہ ایک خطرناک فکر ہے۔ اس فکر کا موجد بھی مغربی

فلسفہ وتصورات ہیں کہ انہوں نے جب Separation کا اعلان کیا تو مذہب کو انہوں نے ایک نجی زندگی سے متعلق کر کے ہٹا دیا تھا۔ جب ایسے مذہب کو جو آپ کو معاشرے میں اٹھنا بیٹھنا سکھاتا ہے اس کو آپ نجی زندگی سے منسلک کر کے ہٹا دوگے تو معاشرے میں اچھا برا پھر لوگوں کی اپنی خواہشات کے مطابق بن جائے گا۔ اس طرح اگر کسی کو حرام کھانا، کرنا اچھا لگتا ہے تو وہ انسان بھی آپ کی نظر میں اچھا ہے اور ایک طرف اپنے رب کی بندگی کرنے والا حرام سے بچنے والا انسان ہے وہ بھی برابر ہے۔ یعنی اس تصور سے اچھے برے کی تمیز ختم ہو جاتی ہے اور اچھا برا ہونا آپ کی خواہشات کے مطابق ہے۔

جب معاشرے میں اس طرح کی فضا توازن اختیار کرلے تو ایک داعی کی نصیحت قبول کرنے میں بھی لوگ بھاگتے ہیں لوگوں کو پھر دینی باتیں تو دور اخلاقی، معاشرتی اور فطری باتیں بھی معلوم نہیں ہوتیں۔ اس طرح ایک معاشرہ مذہب سے دور ایک اپنی دنیا بنالیتا ہے اور اسی سے وہ مغرب کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ کیوں کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے وہ پیسے کمانے کی دوڑ میں لگ جاتا ہے اور اگر اس کے پاس بہت سارے پیسے ہیں تو وہ اس سے آرائش وتزئین کی اشیاء سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

معاشرے میں ایسی فکر کو دین کی طرف راغب کرنے کے لئے بھی سیرت طیبہ میں مثالیں موجود ہیں۔ طائف کے لوگ بھی اسی طرح بڑے ہی پیسے والے امیر تھے۔ ان کی زندگی میں بھی ان کو جو اچھا لگتا ہے وہی ان کے لئے اچھا ہے۔ مصطفی کریم ﷺ کی بعثت سے پہلے انسان کی فکری اور مذہبی باتوں میں چند رویوں کا غلبہ ملتا ہے۔ اس میں ایک طرف خوف ہے جو تمام رویوں کا تعین کرتا ہے تو دوسری طرف امید ومسرت، خوشحالی کے جذبے ہم کنار نظر آتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف انتقام کا مسلمہ اصول مبنی تھا جو معاشرے کی اجتماعی زندگی منضبط کرتا نظر آتا تھا تو دوسری طرف عفو ودرگزر کا اصول رہنما تھا جو فرد کی اخلاقی عظمتوں کا تصور معراج تھا۔ انہی رویوں کی بنیاد پر افراد و معاشرے منظم ہوتے تھے۔ دین اسلام نے ان تمام اصولوں اور رویوں خوف، رجا، انتقام اور عفو کے درمیان توازن واعتدال کی راہ قائم کرتے ہوئے اخلاقی اصولوں کو متعارف کرایا اور انسان کو انتہا پسندی یک طرفہ رجحان سے نجات دلائی۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اس پر طویل لکھا ہے۔ لکھتے ہیں: توسط واعتدال کا اصول اخلاقی زندگی کی روح اور انسان کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کا ذریعہ ہے۔ (17)

انہیں نصیحت کرنے کے لئے سب سے اول کردار کی خوشبوء بکھیرنی ہوگی، اپنے کردار کے ذریعے خوش اخلاقی اور صبر سے ان کو مائل کرنا ہوگا۔ پھر اس طرح کے لوگوں کی مشکلات میں مدد کرنی ہوگی تو ہی وہ آپ کی بات سنیں گے، آپ پر توجہ دیں گے۔ پھر انہیں براہ راست نصیحت کرنے کے بجائے ان کو عملی نمونہ سے کر کے دکھائیں کہ یوں بھی معاشرے میں زندگی گزارنے کے اصول ہیں۔ تو ہمیشہ اس طرح کی باتوں میں داعی کا اپنا کردار بہت ہی خوبصورت ہونا چاہیے، جس طرح ایمان اور حسن خلق لازم وملزوم ہیں اسی طرح ان کے ساتھ تقویٰ (پرہیزگاری)

بھی معلق ہے۔ تقوی انسان کی باطنی کیفیات کا نام ہے، تقوی ایک مستقل راہنمائی ہے، یہ صراط کی استقامت ہے، یہ نیکی پر آمادہ کرتی ہے اور گناہ سے روکتی ہے۔ نور مجسم ﷺ نے سینہ / قلب کی طرف اشارہ فرما کر بتلایا کہ تقوی یہاں ہے۔[18]

سفر طائف سے افادیت اور عصر جدید کا داعی

سفر طائف میں جن مشکلات کا مطالعہ ہم نے کیا ان میں سب سے زیادہ توجہ طلب بات ایک داعی کا تاثر اور عملی نمونہ ہے کہ ان مشکلات میں ایک داعی کو دعوت و تبلیغ میں کیا نمونہ اختیار کرنا چاہیے۔ دعوت کا کام کتنے ہی اچھے منہج سے کرتا ہو لیکن اگر اس کے اسلوب میں کمی ہے تو وہ دعوت اتنی اثر انداز نہیں رہے گی، دعوت کے لئے مبلغ کی بلند کرداری، اعلی ظرفی اور اخلاقی قوت کا تحفظ ہونا ضروری ہے۔ داعی کا کردار اگر خصال حمیدہ سے معطر ہو تو مقناطیسی قوت پیدا کرتا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو اس داعی کی دعوت و تبلیغ میں اثر پیدا نہیں ہو سکتا۔

طائف میں جو ایک داعی کا نمونہ ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے اس میں سراسر حکمت عملی، صبر، استقامت، حالات کا جائزہ، عفو اور درگزر ہے۔ اور تمام معاملات میں التجا و دعا اللہ پاک کی بارگاہ اقدس میں ہے قلت حیلہ، ضعف قوت کی شکایت اپنے معبود برحق کے ساتھ لگی ہے اور صرف اسی کے رضامندے کی طلب ہے، لائم کی ملامت سے بے پرواہی چھائی ہے۔ بس اسی رب کی اطاعت میں توجہ دلی ہے۔

اللہ کے پیارے رسول ﷺ کی تمام تبلیغی سرگرمیاں قرآنی اصولوں پہ مبنی ہیں۔ ان پر نظر کی جائے تو داعی کے لئے سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ ابلاغ من اللہ ہے:

تبلیغ کا منہج "ما أنزل"

ایک داعی کے لئے ہمیشہ اپنے نبی کا ہی نمونہ مقدم ہوتا ہے۔ داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے تبلیغی منہج میں ہمیشہ پہلے وہی بات بیان کرے جو اللہ عَزَّوَجَلَّ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ یہ اصول ہمیں قرآن مجید نے سکھایا:
﴿بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ﴾[19] جب اللہ کریم نے اسلام کو عزت بخشی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

اس کی تفسیر میں امام فخر الدین رازی لکھتے ہیں: " رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا کہ آپ کفایت شعار لوگوں کی کمی کی طرف اور فاسقین کی کثرت کو نہ دیکھیں اور نہ ہی ان کی بدقسمتی و بدحالی کا خوف کریں پھر فرمایا "بلغ" یعنی جو کچھ ان کے رازوں کو افشاں کرنے اور ان کے فسق کے بارے میں اسرار کی باتیں آپ کو بتائی گئیں ہیں اس کو پہنچانے میں صبر کرو۔ بیشک اللہ پاک آپ کو ان کے مکر و فریب سے محفوظ رکھے گا۔[20] معلوم ہوا کہ کسی کو تبلیغ کرنی ہے تو اسی کتاب ہدایت سے باقی ان کو ان کے برے اعمال ان کے منہ پہ نہیں بیان کرنے۔ اسی طرح طائف میں بھی نبی مختار ﷺ نے جب تبلیغ فرمائی تو کتاب اللہ کی آیات تلاوت فرمائیں۔ اب تبلیغ کا باقی منہج کیا ہونا چاہیے تو

قرآن نے اس کا اصل اور منبع بتا دیا فرمایا:﴿مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ﴾[21] جو بھی (منہج) مصطفی کریم ﷺ کی بارگاہ سے صدقہ ہو اسے اپنی دامن مراد میں سمیٹ لو۔

اسی آیت کی تفسیری روایت ہے آپ علیہ السلام نے فرمایا: جو میری حدیث کے ساتھ چمٹا رہا اور اس کو یاد کیا یعنی پیروی کی وہ قرآن کے ساتھ محفوظ رہا، اور جس نے قرآن اور میری سنت سے غفلت برتی وہ دنیا و آخرت سے محروم ہو جائے گا۔ اور تم لوگوں کو امر کیا گیا ہے کہ میری بات مانو، میرے معاملات پہ راضی رہو اور میری سنت کی پیروی کرو پس جو میری بات پہ راضی ہوا وہ قرآن سے راضی ہوا۔ جس نے میری باتوں کا استہزاء کیا گویا اس نے قرآن کا استہزاء کیا۔[22]

تبلیغ کا اُسلوب" الحكمة والموعظة"

قرآن مجید نے تبلیغ کے منہج کو بھی واضح کیا ہے تو تبلیغ کے اُسلوب کا پتہ بھی بتایا ہے۔ ایک داعی کے لئے ہمیشہ نرمی اور حکمت عملی شامل حال ہونی چاہیے اور اچھی بات کرنا چاہیے قرآن کریم نے فرمایا: ﴿ادْعُ ....بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ﴾[23] تبلیغ کرنے اور اللہ کی طرف بلانے کے لئے جو اُسلوب ہے اس میں حکمت عملی اور اچھائی کے ساتھ، نیکی کے ساتھ لوگوں کو الی اللہ بلانا ہے۔ اب ایک داعی کے لئے اس حکمت کے تحت بہت ساری باتیں واضح ہوتی ہیں کہ وہ کسی کو دعوت دے تو صرف "انذار" سے کام نہ لے، موقع کی مناسبت سے بات کرے، جذبات کے تناؤ کو بھی دیکھے، نرم خوئی اور دلسوزی کے ساتھ ایسی اچھی بات کرے جو سامعین کے عقل کے مطابق ہو اور پوری طرح سے اثر رکھتی ہو۔ مصطفی کریم ﷺ کا بھی یہی فرمان ہے:" أُمِرْنا أَنْ نُكَلِّمَ الناسَ على قدرِ عُقُولِهم "[24] ہمیں لوگوں کی عقل کے مطابق کلام کرنے کا حکم کیا گیا ہے۔

مبلغ دین کی بات واضح کرے باطل کے بہکاوے میں نہ آئے

حق اور باطل میں ایک کشمکش رہتی ہے اور یہ ایک فطری عمل ہے لیکن اس میں ایک مبلغ کو اپنی بات پہ ثابت قدم اور کھرا رہنا چاہیے، کبھی بھی اپنی بات میں کوئی شک و شبہ والا تاثر پیدا نہ کرے اس طرح کے معاملات میں ثابت قدم رہنے سے اللہ عزوجل کی مدد شامل حال ہوتی ہے۔ اللہ عزوجل قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:﴿وَإِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغَالِبُونَ﴾[25] "بیشک ہمارا لشکر یہی غالب آنے والے ہیں" حضور علیہ السلام کی سیرت طیبہ سے بھی ہمیں جو درس ملتا ہے اس میں بھی صاف کھری بات کہنا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کچھ لو اور کچھ دو والی بات ہوئی ہو۔ قرآن مجید نے بھی اس پر باطل کے ساتھ سازگاری کرنے کو سختی کے ساتھ منع کیا ہے۔ آپ علیہ السلام کو بھی بہت مرتبہ کافروں نے آفر دیئے پیسوں کی، سرداری کی، بادشاہت کی پیش کش کی حضرت ابو طالب سے کہلوایا لیکن آپ علیہ السلام نے کبھی بھی باطل کے ساتھ دوستانہ نہیں کیا۔ تو ایک داعی بھی جب اپنے اخلاص کے ساتھ دین کی دعوت

دینے لگے گا تو ایسے مراحل آئیں گے اس دوران قرآن مجید اور سیرت مطہرہ کو اپنا مشعل راہ بنائے رکھے باطل کی چمک دمک پہ دل نہ ہارے۔

عفو و درگزر اور تحمل مزاجی

ایک داعی جب پورے اخلاص سے دین کی دعوت دیتا ہے تو مشکلات اس کے گھر سے جنم لیتی ہیں۔ پھر وہ مشکلات پڑوس پھر اپنے شہر اور جتنا تبلیغ کا دائرہ بڑھتا ہے مشکلات اتنی ہی بڑھ جاتی ہیں۔ ایسے میں ایک داعی کو جو اصول حضور علیہ السلام کی سیرت مبارکہ سے حاصل ہوتا ہے کہ جب آپ پر لوگ تنز و طعن کر رہے ہوں، جب آپ کی باتوں کو نہ مانا جائے، جب لوگ آپ کی ذاتیات پہ آجائیں نہایت ہی تحمل سے انہیں اللہ کی آیات سنائیں باطل کی بے بنیاد بحثوں میں پڑنے سے، خام خیال الزامات میں الجھنے سے، بے مقصد اشتعال انگیزیوں، اعتراضات، پروپیگنڈوں اور ہتھکنڈوں میں وقت اور صلاحیتوں کے استحصال ہونے سے اجتناب برتیں۔ گویا کوئی بھی حال و قال ہو کوئی بھی صورت ہو اپنے مقصد کو نگاہوں سے دور نہ ہونے دیں۔ اس کی صاف اور واضح مثال آپ علیہ السلام کے سفر طائف میں ملتی ہے کہ لوگ جان پر آئے بنے لیکن حضور علیہ الصلاۃ والتسلیم اپنے مقصد پہ گامزن رہے، کبھی بھی مقصد کو ترک نہیں کیا۔

قول و فعل میں یکسانیت

داعی کا اپنے قول و فعل میں یگانہ ہونا ضروری ہے، تبلیغ کی راہ میں ہمیشہ سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز یہی ہوتی ہے کہ لوگ مبلغ کے قول و فعل میں تضاد کو ابھار کر اس کو چپ کرا دیتے ہیں۔ ایک داعی کے لئے ہمیشہ دعوت دین میں جو قول اور نصیحت کی بات وہ خود کرتا ہے وہ باتیں اس کے اپنے اندر بھی پائی جانا ضروری ہیں۔ اس بات پہ سب سے پہلے قرآن کریم تنبیہ کرتا نظر آتا ہے ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ [26] تم وہ بات کیوں کرتے ہو جس کو تم خود کرتے نہیں۔ اب قرآن کریم اپنے جامع انداز میں مبلغ کو سمجھا رہا ہے کہ ایسا قول اور بول نہ کہنا جس پر تم خود عمل پیرا نہ ہو۔ اس آیت کی تفسیری روایات میں ایسے واعظین و مبلغین کے لئے جن کے قول و فعل میں تضاد ہے وعید بھی سنائی گئی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا مطالعہ ہمیں یہی بتاتا ہے کہ آپ کی دعوتی سرگرمی میں نمایاں پہلو یہی تھا کہ آپ علیہ الصلاۃ والتسلیم کے ہاں قول و فعل میں تفاوت نہیں تھا، مکمل مطابقت پائی جاتی تھی۔ ہادئ عالم ﷺ نے اپنے پہلے ہی خطاب میں کوہ صفا پر جس چیز کو نمونہ اور دلیل کے طور پر پیش فرمایا وہ آپ علیہ السلام کی طرز حیات تھی۔ قرآن مجید نے بھی حضور علیہ السلام کی زندگی مبارک کو بنیاد رکھ کر توحید و دعوت دی ہے، فرمایا: ﴿فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا﴾ [27] میں نے اب تک اپنی تمام زندگی تمہارے بیچ گزاری ہے کیا تمہیں عقل نہیں۔ یعنی آپ علیہ السلام نے

انہیں بناتا چاہا کہ اب تک میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس میں شبہ ہو تو اللہ عزوجل کے متعلق میں ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں

حوالہ جات

(1) الزخرف:31

(2) الزخرف:32

(3) احمد، احمد بن حنبل، امام، متوفی:241ھ، مسند، ج39، ص504، ط:الاولی– 2001ء، مؤسسۃ الرسالۃ

(4) مسند احمد، ج31، ص288، رقم:18958

(5) یومَ تبلی السرآئرِ (الطارق:9)

(6) یہ تمام سورہ طارق کی تفسیری روایات سے بیان ہوا ہے۔ ملاحظہ: موسوعۃ التفسیر الماثور، ج 23، سورۃ الطارق، ط: الاولیٰ–2017ء، مرکز الدراسات والمعلومات القرآنیہ بمعہد الإمام الشاطبی- دار ابن حزم- بیروت۔

(7) ضیاء النبی، ج2، ص309۔

(8) التغابن، آیت:02

(9) الحدید، آیت:16

(10) ورک، دعوتِ دین میں درپیش چیلنجز اور علماء کی ذمہ داریاں، ڈاکٹر محمد اکرم، ماہنامہ الشریعہ شمارہ 5، جلد 31، مئی 2020ء۔

(11) Constitution of the Islamic Republic of Pakistan, Article 2.

(12) سرخسی، محمد بن أحمد بن أبی سہل، شمس الأئمۃ، متوفی:483ھ، المبسوط، ج1، ص37، ط:1978ء، دار المعرفۃ–بیروت، لبنان

(13) ابن سعد، الطبقات، ج1، ص198۔

(14) السیوطی، جلال الدین، ابو الفضل، الشافعی، امام، متوفی: 911ھ، جمع الجوامع (الجامع الکبیر)، ج6، ص 293، ط: الثانیۃ–2005ء، الأزہر الشریف، القاہرۃ- جمہوریۃ مصر العربیۃ۔

(15) الطبقات ابن سعد، ج1، ص224، وفد تمیم۔

(16) طیالسی، سلیمان بن داود بن الجارود، متوفی:204ھ، مسند ابی داؤد الطیالسی، ج1، ص202، رقم:248، ط:الاولی– 1999ء، دار ہجر–مصر۔

(17) خالد علوی، ڈاکٹر، انسان کامل ﷺ، ص623، اشاعت: ہشتم، نومبر 2016ء، الفیصل ناشران، لاہور۔

(18) التقوی ھٰھنا۔ سیوطی، جامع الکبیر، ج3، ص605، (ال مع التاء)

(19) المائدہ، آیت:67۔

(20) فخر الدین رازی، مفاتیح الغیب / تفسیر الکبیر، ج12، ص399، سورہ مائدہ، آیت:67، ط: الثالثۃ- 1420ھ، دار إحیاء التراث العربی-بیروت۔

(21) الحشر، آیت:7۔

(22) موسوعۃ التفسیر الماثور، ج21، ص486-87، حدیث:76231، سورۃ الحشر، آیت:7

(23) النحل، آیت:125

(24) سیوطی، جامع الکبیر، ج2، ص88۔

(25) الصافات، آیت:173۔

(26) الصف، آیت:2۔

(27) یونس، آیت:16۔